سفرنامہ

ہنگول کے سنگ

ہنگلاج مندر اور کنڈ ملیر ساحل کا ایک یادگار سفر

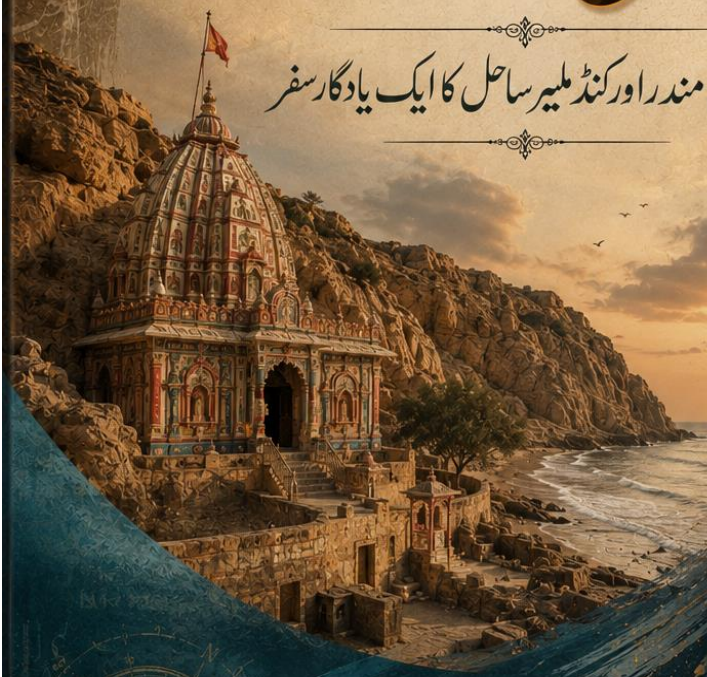

حافظ محمد شارق

2015

ہنگول کے سنگ

سفرنامہ

حافظ محمد شارق

دسمبر 2015 کے موسم سرما کا آغاز تھا۔ سردی کی لہر کا آغاز ہوئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے اور میں ایک طویل پراجیکٹ سے فارغ ہو کر بیٹھا تھا۔ یونیورسٹی کے امتحانات بھی ختم ہونے کے قریب تھے اور دل اس بات پر مصر تھا کہ اب کہیں سیاحت کا پروگرام بنایا جائے۔ اسکول کے یاروں سے ابھی حال ہی میں دوبارہ رابطہ بحال ہوا تھا اور ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ ایک دن ہنگامۂ دنیا سے باہر کہیں گزاریں۔ بالخصوص ہمارے دوست فیضان علی سے جب سیاحت کا ذکر کیا تو فوراً ہی سیر و فی الارض پر عمل کرنے تیار ہو گئے۔ کافی رد و قدح کے بعد فیضان اور میرے بھائی محمد سالک کے علاوہ شایان سرور، عبد الباسط، محمد شوکت اور کچھ بقیہ دوست بھی تیار ہوئے اور

سب کے باہمی مشورے سے یہ طے پایا کہ سندھ کے جنوب میں واقع بلوچستان کے ہنگول نیشنل پارک کی سیاحت کی جائے۔ میں نے ہنگول تیر تھ (ہندوؤں کی مقدس زیارت گاہ) کے بارے میں پڑھ رکھا تھا، اس لیے اس جگہ کا نام سنتے ہی مندر جانے کی شرط کے ساتھ میں نے بھی اس پروگرام کی بھرپور حمایت کی۔

صوبہ بلوچستان کے جنوب مغربی حصہ بظاہر تو بنجر اور غیر آباد علاقہ ہے، یہاں کوئی بڑا شہر بھی واقع نہیں ہے، حالیہ گوادر پورٹ گو کہ تعمیر ہو چکا ہے مگر ابھی اسے امتیازی حیثیت ملنے میں شاید کچھ دہائیاں درکار ہیں۔ اس خطے میں پسماندگی کا عالم یہ ہے کہ آپ کو میلوں سفر کرتے ہوئے موبائل نیٹ ورک نہیں مل سکے گا۔ کئی کلو میٹر کے بعد کہیں کوئی کچا مکان نظر آئے گا جو اپنی اس ویرانی میں اپنی بے رونقی کا مرثیہ پڑھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ غیر آباد اور ویران صحرا قدرتی حسن اور دلفریب مناظر اپنی گود میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہیں ایک جانب امید کی دیوی اور اس کا محافظ شیر موجود ہے تو دوسری جانب دریائے ہنگول کے دامن میں ہنگلاج ماتا کی قدیم زیارت گاہ ہے۔

دوستوں نے بھی پر جوش ہو کر اس ٹور (Tour) کو پلان کیا اور فیضان علی نے خاص طور پر اس پروگرام کو عملی شکل دی۔ ٹور آرگنائزر تلاش کرنا، ان سے معامات طے کرنا اور دیگر سبھی امور انھوں نے انتہائی خوش اسلوبی اور سرعتِ رفتار سے انجام دیے اور بالآخر طے پایا کہ 13 دسمبر رات دو بجے ہم کراچی سے روانہ ہوں گے۔

روانگی

13 دسمبر وقتِ مقررہ پر ہم کراچی کے علاقے ٹاور پہنچے، جہاں پلان کے مطابق ٹور گروپ کی گاڑی ہمیں پک کرنے آنی تھی۔ ہماری ٹور آرگنائزر کا نام ''مُزنا'' تھا جنھوں نے اس شعبے میں حال ہی میں قدم رکھا تھا۔ چونکہ نصف شب ہو چکی تھی' اس لیے گاڑی آتے ہی بنا توقف سب اپنی اپنی مناسب سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میرے نصیب میں ہم سفر ایک باریش باتونی انکل تھے جو پیشے کے لحاظ سے نائب صوبیدار تھے مگر مزاج میں اس کے برعکس اسٹیج کے اداکار زیادہ لگتے تھے۔ تھوڑی دیر ہی گزرتی تھی کہ وہ کوئی نہ کوئی لطیفہ نما بات کہتے اور مزید خوشگواری کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیتے جس پر چار و ناچار کئی بار مجھے بھی ہاتھ مارنا ہی پڑا۔ اس وقت بھی دمِ تحریر وہ کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ گنگنا ہی رہے ہیں۔ بہر حال ہم کراچی سے تقریباً رات ڈھائی بجے ہم کراچی سے براستہ حب چوکی روانہ ہوئے۔

سلام بلوچستان

حب چوکی گزرنے کے بعد شہر کی رونقیں کم ہونے لگیں اور گاڑی سندھ اور بلوچستان کے درمیانی صحرائی علاقے سے گزرتے ہوئے براستہ کوسٹل ہائی وے اپنی منزل کی جانب بھاگی چلی جا رہی تھی۔ رات چونکہ خاصی تاریک ہو چکی تھی اور راستے بھی بالکل ویران تھے، اس لیے کھڑکی سے باہر دیکھنے میں خاص دلچسپی نہ رہی، موبائل سروس یہاں بالکل نہیں تھی، اس لیے انٹرنیٹ سے کسی دلجوئی کا اہتمام بھی ممکن نہ تھا۔ یہ صورت ہمارے لیے پریشان کُن لیکن ہم سفر صوبیدار صاحب کے لیے انتہائی موزوں تھی کیونکہ ان کی بھرپور تفریح کے لیے ہمیں موجود ہونا لازم تھا۔

ساری رات کوئی ساڑھے تین چار گھنٹے سفر کرنے کے بعد نمازِ فجر کا وقت ہونے لگا تھا اور ہمارے شکم بھی اب ناشتے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ چنانچہ متفقہ فیصلے سے ہم بلوچستان کے علاقے اوتھل سے چند کلومیٹر فاصلے پر رُکے۔ یہ ایک صحرائی اور ویران جگہ تھی۔ ایک جانب چائے کا ہوٹل، بمشکل 15 گز پر مشتمل ایک چھوٹی سی مسجد اور ساتھ ہی متصل ایک بیٹھک بنی ہوئی تھی۔ اس وقت دانت بجا دینے والی سردی تھی اور مجھ سمیت تمام لوگوں نے اپنے اپنے گرم کپڑے نکال لیے تھے۔

صبح کا منظر

بڑی مشکل سے یخ بستہ پانی سے وضو کرنے کے بعد ہم نے نمازِ فجر ادا کی۔ اس موقع پر ہمیں اس بات کا بھی احساس ہوا کہ کیوں بعض شرائط کے ساتھ موزوں پر مسح اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔

یہاں دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ہمارے گروپ کی لیڈر مُنیزا جو کہ کرسچن خاتون تھیں، انھوں نے بھی ہمیں دیکھتے ہوئے وضو کرکے سر پر دوپٹہ اوڑھ کر مسجد میں نماز کے لیے چلی گئیں۔ انھیں دیکھ کر ہم سبھی محوِ حیرت تھے مگر بعض دوستوں کو زیرِ لب یہ شکایت تھی کہ ایک کرسچن خاتون جینز ٹی شرٹ میں مسجد کیوں گئی؟ ایک جانب دوستوں کی چہ مگوئی رواں تھی تو دوسری جانب منزا چادر اوڑھے انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کر رہی تھیں۔ انھیں دیکھ کر میں ایک لمحہ سوچنے لگا کہ نہ جانے کیوں ہم نے اپنی مساجد کے دروازے غیر مسلموں کے لیے بند کر رکھے ہیں ورنہ نہ جانے کتنے ہی لوگوں کے لیے محض یہ عبادت ہی کتنی کشش رکھتی ہے۔

اب صبح کے چھ بج رہے تھے۔ سورج ابھی انگڑائی لیے اٹھ ہی رہا تھا اور ہم نمازِ فجر سے فارغ ہو کر ناشتے کا انتظار کر رہے تھے۔ موسم قدرے سرد تھا اور لکڑیوں پر پکی ہوئی چائے گو کہ بدذائقہ تھی مگر اس سخت سردی میں جسم

کو گرمی پہچانے کا واحد حل یہی تھا۔ لہٰذا منہ بسورتے ہوئے ہی سب نے ناشتہ کیا اور یہیں تصاویر لینے میں مصروف ہو گئے۔

بعد نمازِ فجر

محمد فیضان، شوکت ڈیڈھی اور میرے بھائی محمد سالک (دائیں جانب سے)

یہاں ہوٹل کے عقب میں ایک ٹریکٹر بھی کھڑا تھا، جسے دیکھتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ اسے چلانے کا تجربہ بھی کرنا چاہیے۔ مالک کی اجازت لے کر ہم سبھی نے وہ ٹریکٹر چلانے کی کوشش کی۔ سبھی دوستوں نے کامیابی سے ٹریکٹر چلایا مگر میں اکیلا ہی ناکام رہا۔ شاید میرے نصیب میں قلم چلانا ہی رہا۔

اب ہم اپنی منزل کی جانب بڑھے۔ گاڑی کوسٹل ہائی وے پر رواں دواں تھی اور ہر جانب بالکل سناٹا تھا۔ اگر آپ بلوچستان کے سفر کا ارادہ رکھتے ہیں تو اپنے ساتھ تمام ضروری سامان ضرور رکھ لیں کیونکہ یہاں کئی کئی کلومیٹر تک انسان تو کجا، کتے بھی نظر نہیں آتے۔ اس پر مزید یہ کہ موبائل نیٹ ورک کا بھی کوئی آسرا نہیں ہوتا جس سے آپ سے کسی کو کال کر کے بلا سکیں۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ احتیاطی طور پر تمام چیزیں اپنے پاس رکھیں اور گاڑی کی سروس بھی درست رکھیں۔

جوں جوں سورج ہمارے سر کے قریب آرہا تھا، ہم اپنی منزل سے بھی قریب ہو رہے تھے۔ راستے میں دونوں جانب سمندر اور پہاڑ تھے مگر پہاڑ کی کٹائی سے تشکیل پانے والے ایسے کئی نظارے تھے جنھیں دیکھ کر خود آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ پہاڑ اس طرح سے تھے گویا مختلف عمارتیں بنی ہوئی ہوں۔ ابھی ہم کوسٹل ہائی وے پر گزشتہ مقام سے چند کلو میٹر اور کراچ سے تقریباً90 کلو میٹر کی مسافت پر تھے کہ ایک جگہ سڑک کنارے بڑے عجیب و غریب پہاڑوں کا ایک وسیع و عریض سلسلہ پھیلا ہوا نظر آیا جو سڑک کے دونوں اطراف پر تھا۔ میں ابھی ڈرائیور سے اس جگہ کے متعلق پوچھنے ہی لگا تھا کہ اچانک ڈرائیور نے خود ہی بریک لگا دیا اور ہماری آرگنائزر نے سب کو باہر آنے کو کہا۔

کوسٹل ہائی وے کی پہاڑیاں

گاڑی سے اترتے ہی میری نگاہ سب سے پہلے اس مجسمے کی جانب اٹھی جو ”امید کی دیوی“ کہلاتی ہے۔ ذرا اور آگے بڑھے تو ایک اور مجسمہ نظر آیا جو دور سے اپنے خدوخال میں تقریباً ہندوؤں کے وشنو دیوتا سے مماثلت رکھتا تھا۔ ان دونوں کے پڑوس میں ذرا سا دور ایک شیر نما مجسمہ نظر آرہا تھا جو یوں لگ رہا تھا جیسے ان دونوں شہزادیوں کی حفاظت کے لیے مامور تھا۔

اسفنکس اور امید کی دیوی

اہرام مصر کے قریب بیٹھے ایک انسان نما شیر ابو الہول (Sphinx) کے بارے میں یقیناً آپ نے پڑھا اور سنا ہو گا۔ مصر میں واقع وہ مجسمہ تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ ایک بڑی چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا جو کہ فرعون (Khafre) کی شبیہہ ہے۔ ان مجسموں کی تاریخ مورخین بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے رہے ہیں مگر ایک سفنکس بلوچستان میں بھی واقع ہے۔ یہ مصر کے Sphinx سے مشابہت رکھتا ہے۔ کچھ تاریخ دانوں کے مطابق یہ مجسمہ 750 سال قدیم ہے لیکن یہ محض اندازہ ہی ہے۔

ذرا ہی آگے ایک دیوی کا مجسمہ شاہی چغہ اوڑھے کھڑا ہے۔ اس مجسمے کا نام مشہور اداکارہ انجلینا جولی نے ”پرنسس آف ہوپ“ یعنی امید کی دیوی پاکستان کے دورے پر تجویز کیا تھا۔ یہ بات عام طور پر بیان کی جاتی ہے کہ

انجلیا جولی کی توجہ سے قبل بحیرہ عرب کے ساحل پر کھڑی دیوی، اس کا شیر نما دوست اور ایک تنہا کھڑے اس مجسمے کے بارے انجلینا جولی کی توجہ سے قبل کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر حقیقت ہے یہ ہے کہ 1882 کے ایک اینگلو انڈین سیاح چارلس (Charles MacGregor 1840-1887) نے اپنی کتاب Wanderings in Baluchistan میں بھی ان تینوں عظیم القامت مجسموں کا ذکر کیا ہے۔

Princess of Hope---امید کی شہزادی

گھاٹی

دیکھ بھال کر دامن بچاتے ہوئے بیس منٹ کی جدوجہد کے بعد ہم پہاڑ پر چڑھ چکے تھے جہاں امید کی دیوی کھڑی تھی۔ وہاں کچھ دیر تصاویر لی اور قدرت کے اس شاہکار کو ہر جانب سے دیکھنے کی سعی کی۔ مجسمے کے ایک جانب پہاڑی گھاٹیاں انتہائی اچھوتے انداز میں ہے جنھیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں کوئی عبادت گاہ یا بستی قائم تھی۔ اور پھر یہ تینوں مجسمے آخر ہیں کیا؟ کب سے موجود ہیں اور ان کی تاریخ کیا ہے؟ کیا یہ واقعی قدرت کا شاہکار ہے یا کسی انسانی ہاتھوں کی تخلیق ہے۔ ان سارے سوالوں کے جواب دینا فی الحال ہمارے لیے انتہائی مشکل ہے۔ اگر یہ انسانوں کی تخلیق ہے تو یہ سوال بہرحال اپنی جگہ رہتا ہے کہ آخر اتنے اونچے اور پتھریلے پہاڑوں پر ایسے دیو قامت مجسمہ کس مقصد سے بنائے گئے تھے؟

زیادہ تر ماہرین یہی مانتے ہیں کہ یہ قدرتی کٹاؤ کے باعث بننے والی پہاڑیاں ہیں۔

ہِنگلاج ماتا تیرتھ

پہاڑوں پر چڑھنے اور مسلسل سفر کی وجہ سے اب جسم کچھ تھکان سے بھر رہا تھا۔ مگر ابھی ہماری ایک منزل باقی تھی جس کی تاریخ کم و بیش 3500 برس سے بھی زیادہ پرانی ہے؛ ہنگلاج ماتا مندر۔ ہم دوبارہ گاڑی میں سوار ہوئے اور اگلی منزل پر روانہ ہوئے۔ کراچی سے 120 کلومیٹر شمال مغرب میں یہ مندر ہنگول نیشنل پارک میں ہنگول دریا کے کنارے پر واقع ہے۔ یہ ہندوؤں کے مطابق زمین پر مقدس ترین جگہوں میں سے ایک ہے۔ مقامی مسلمانوں کے لیے نانی پیر کا آستانہ اور ہندوؤں کے لیے ستی اور ہنگلاج ماتا کا استھان ہے۔ اس مندر میں واقع مقدس پتھر کو ہندوستان بھر میں واقع

پچاس شکتی پیٹھ میں سے اہم ترین پیٹھ سمجھا جاتا ہے اور یہی مندر کا قدیم ترین حصہ ہے۔ یہ زیارت گاہ بنجر لیکن خوبصورت پہاڑوں کے دامن میں واقع تھی۔

راستے میں بہت سے نایاب پرندے اور جانور نظر آرہے تھے، پہاڑیاں پچھلے راستے کی ہی طرح مختلف سطحوں سے مزید انتہائی خوبصورت نظر آرہی تھیں لیکن بعض پہاڑ بہت ہی نوک دار قسم کے تھے جو دور سے ایسے لگ رہے تھے جیسے کوئی پہاڑ پر کانٹے اُگ آئے ہوں۔

مندر کی حدود سے باہر ہمیں آرمی والوں نے روکا اور کچھ ضروری پوچھ گوچھ کے بعد آگے جانے کی اجازت دی۔ سامنے ایک چھوٹا سا آہنی گیٹ تھا جس کے بعد مندر کی حدود شروع ہوتی ہے۔ یہ حدود شروع ہوتے ہی پہاڑی غاروں میں قائم ان قدیم مندروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مندر کے شروع میں دائیں جانب زائرین کے قیام کے لیے گیسٹ ہاؤس اور کمرے

بنے ہوئے تھے۔ یہاں بجلی کا انتظام سولر انرجی کے ذریعے کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ مندر بلوچستان میں واقع ہے اور یہاں ہندوؤں کی آبادی بھی نہیں ہے، اس لیے عام طور پر ہنگلاج کے یہ تمام مندر ویران رہتے ہیں اور سوائے مندر کے پجاریوں اور چند لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔ البتہ ہر سال اپریل میں ایک بار کراچی سے ہندو یاتریوں کا قافلہ ہنگلاج جاتا ہے، ان یاتریوں میں بھارت، بنگلہ دیش اور نیپال سے آئے ہوئے یاتری شامل ہوتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہاں آنے والے زائرین گمشدہ بھی ہوئے ہیں جن کی وجوہات مختلف بتائی جاتی ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس بات کی کتنی صداقت ہے کہ یہاں کئی انسانوں کو بھی مذہبی قربانی کے بھینٹ چڑھایا جا چکا ہے؛ اور گمشدگی کی ایک بڑی وجہ یہی انسانی قربانی ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض پروپیگنڈا ہے اور اصل وجہ بلوچستان کی ناساز سیاسی صورت حال ہے جس نے امن و امان کو خاصا متاثر کیا ہوا تھا۔ لیکن اب یہ صورت حال کافی بہتر ہو چکی ہے اور ہمیں بھی وہاں سناٹے کے باوجود کوئی خوف محسوس نہ ہوا۔

کچھ آگے ایک چھوٹا سا مندر واقع تھا۔ ہم اس چھوٹے سے مندر میں داخل ہوئے۔ یہاں ہندوؤں کی دیوی ماں کا بت تھا اور درمیان میں آگ جلانے کی جگہ تھی۔ یہ مندر بہت زیادہ قدیم نہ تھا۔ چند چیزیں دیکھ کر، ایک تصویر بنا کر ہم آگے چلے گئے۔

اب ہم پہاڑی راستے سے ہنگلاج کے اندرون حصے کی جانب جا رہے تھے۔ یہاں ایک جانب دریائے ہنگول کی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں پانی بہہ رہا تھا اور پہاڑوں پر دور دور تک زیارت گاہیں اور عَلَم بنے ہوئے تھے۔ یہ عَلَم کم و بیش اسی طرح تھے جیسے ہمارے اہل تشیع کے ہاں ہوتے ہیں۔

جوں جوں ہم مندر کی حدود میں داخل ہو رہے تھے، خوبصورت سرُوں اور طرز کے بھجن ہماری سماعتوں سے قریب تر ہوئے جا رہے تھے۔ ہمارے دوستوں کو یہ بھجن انتہائی بُرے لگ رہے تھے کیونکہ ان کے فہم کے مطابق یہ ''بھجن'' ہندوؤں کا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھجن وہ اپنے دیوتاؤں کے لیے کر رہے ہوں گے مگر چونکہ اس میں کسی مخصوص دیوتا کے بجائے صرف ایشور یعنی خدا کا ذکر تھا، اس لیے میں اسے اللہ رب العزت کی نسبت سے محسوس کر رہا ہے۔ اُس وقت بھجن کے الفاظ میں توحید اور خدا کی تمجید ہی بیان کی جا رہی تھی۔ سنسکرت سے واقفیت رکھنے کے سبب میرے لیے یہ بھجن خدا کی حمد و ثنا کے احساس سے لبریز تھے۔

ویسے یہ بہت عجیب بات ہے کہ ہمارے ہاں عام لوگ کیا، اہل علم میں دوسروں کی مذہبی زبان سے متعلق ایک قسم کا تعصب موجود ہے۔ کہیں کسی موقع پر اللہ کے لیے ایشور، پرماتما کے الفاظ استعمال کیے جائیں تو بہت سے لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے حالانکہ قرآن مجید کے ہندوستانی تراجم میں یہ

الفاظ بالکل عام ہیں جو جید علما نے کیے ہیں۔ یہی صورت اس وقت یہاں تھی، غالباً باسط اور شوکت نے خصوصی طور پر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھی، جبکہ میں ان الفاظ میں خدا کی حمد و ثنا سے محفوظ ہو رہا تھا۔

اے خدا۔۔ تو کائنات کے ذرے ذرے میں عیاں ہے!

تیری ہمہ گیر رحمت ماں کی طرح رحمت سے بھی کئی درجہ زیادہ ہے

تو ہی ہے جو اس کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے

ہم تیرے حضور جھکتے ہیں۔۔ ہم پر سلامتی کا نزول ہو۔۔ سلامتی ہو ۔۔ سلامتی ہو۔۔

مندر کے اندرون جانب جاتا ہوا راستہ

فیضان اور شایان کے ہمراہ

میرے لیے ادیانِ عالم کے تاریخی مقامات ہمیشہ سے ہی انتہائی محسور کن اور اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ اس لیے میرے دوست تو اپنی شرارتوں میں مصروف تھے اور میں تنہا ادھر ادھر گھومنے لگا۔ میں اس وقت ایک عجیب

سے احساس میں گم تھا۔ کبھی میری نگاہ کسی پتھر میں چھپے بت تلاش کرتی، کبھی میں ان عقیدت مندوں کو دیکھتا جو بتوں کے آگے سر جھکائے اپنی امید باندھ رہے تھے۔ ایک خاتون کسی مقدس پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے انتہائی رقتِ قلبی کے ساتھ دعائیں کر رہی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے یقین ہوا کہ خدا تو در حقیقت ہمارے دلوں میں رہتا ہے۔ کوئی اسے ان دیکھے پوج رہا ہے، کوئی پتھروں کے توسط سے اس کا قرب پانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن حقیقی قرب وہی پا سکتا ہے جو خدا کے حکم کے مطابق ہو۔ کاش ہمیں یہ توفیق ہو کہ ہم ان بھولے بسرے لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بن سکیں۔

مندر کی زیارت گاہ

اب ہم مندر کے اصل حصے تک پہنچ چکے تھے جہاں ''دیوی ماں کا استھان'' واقع ہے۔ یہی ہنگلاج تیرتھ کا اصل حصہ ہے۔ ایک جانب سیاہ رنگ کے غار ہیں۔ اس سیاہی کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ ہنگول راجہ کو جلانے کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ اس وقت وہاں کبوتروں نے گھونسلے بنائے رکھے تھے۔ دوسری جانب اس میں سیڑھی سے اوپر ایک چھوٹا سا مندر ہے جہاں پجاری صاحب بیٹھتے ہیں۔ اس مندر کی دیوار کے ساتھ ہی ایک صحن بنا ہوا ہے جہاں پرندوں کو باجرہ ڈالا جاتا ہے۔

دیوی ماں کا استھان۔۔ پیچھے سیاہی رنگ واضح ہے۔

ہندوؤں کی مقدس کتب بالخصوص پرانوں کے مطابق ستی دیوی نے اپنے والد پرجاپتی دکشا کی مرضی کے خلاف شیو سے شادی کرلی تھی۔ دکشا نے یجنا یعنی قربانی کی رسم منعقد کی اور مگر شیوا اور ستی کو مدعو نہیں کیا۔ ستی اور شیوا جب اس رسم کے موقع پر پہنچے تو دکشا نے ان دونوں کی تذلیل کی جسے تاب نہ لاتے ہوئے ستی نے آگ میں کود کر اپنی جان دے دی۔ شیوا اس کی لاش لیے ساری کائنات میں پھرتے رہے۔ آخر میں وشنو دیوتا نے ستی کی لاش کے 52 ٹکڑے کرکے پھینک دیے۔ روایات کے مطابق اس کا سر ہنگلاج کے اسی مقام پر گرا تھا جہاں آج مندر واقع ہے۔

جبکہ ایک اور روایات کے مطابق یہاں دیوی ماتا نے کھشتریوں کی حفاظت کے لیے ہنگول نامی راجہ کو اپنے مشہور ہتھیار تشول سے قتل کیا تھا۔ یہاں کالی ماتا اور شیوا دیوتا کی تمام صورتوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ مقامی مسلمان اسی دیوی کو بی بی نانی سے منسوب کرتے ہیں۔ جن کے بارے میں تاریخ زیادہ واضح نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں شیو کے بارے میں اول الذکر روایت دراصل ایک اساطیر ہے جو کسی مقدم واقعے کے سبب اس سے منسلک کر دیا گیا ہے جبکہ حقیقت یہی ہے کہ یہ کسی مقامی عورت کی بہادری سے وابستہ ہے چونکہ یہاں قدیم مندر پہلے ہی واقع تھا اس لیے اسے شیو سے خاص طور پر منسوب کر دیا گیا۔ ممکن ہے یہ واقعہ اسلامی دور کے بعد کا ہو۔ مسلمانوں کے مشہور صوفی بزرگ شاہ عبد الطیف بھٹائی نے بھی ہندو جوگیوں کے ہمراہ اپنی اس زیارت گاہ کا سفر کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے بعض صوفیاء کے ہاں بھی اس مقام کی کچھ نہ کچھ اہمیت بہر حال موجود ہے۔

میں مندر کی سڑھیوں سے اوپر چڑھ کر اندر داخل ہو گیا۔ ہی بہت چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک طرف کچھ بتوں کی تصویر، دوسری طرف نذر و نیاز کا سامان رکھا تھا۔ درمیان میں پنڈر صاحب بیٹھے تھے اور ارد گرد لوگ پنڈت صاحب کو اپنا ہاتھ دکھا کر اپنے مستقبل میں امید کی تلاش کر رہے تھے۔

پنڈت صاحب جونہی فارغ ہوئے، میں ان کے پاس حاضر ہو گیا۔ میرے بیٹھنے ہی انھوں نے میرا ہاتھ اس گمان سے تھام لیا کہ شاید میں بھی وہاں قسمت کا حال جاننے آیا ہوں۔ لیکن میں نے فوراً ہی ہاتھ گھماتے ہوئے انھیں سلام کر دیا۔ جس سے ایک لمحہ وہ چونک گئے۔ اس کے بعد میں نے انھیں اپنا تعارف کروایا اور یہاں کی تاریخ کے بارے میں استفسار پیش کیا۔ انھوں نے کم و بیش وہی روایات سنائیں جو میں پران میں پڑھ چکا تھا۔ البتہ ہندو الٰہیات پر جب مزید گفتگو کرنا چاہی تو انھوں نے کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ مگر میں نے مزید سوالات اور نکات پیش کیے تو انھوں نے انکشاف کیا کہ انھیں نہ ہی سنسکرت سے واقفیت ہے اور نہ ہی مقدس کتابوں کی شدھ بدھ ہے۔ تہواروں کے موقع پر زیادہ تر ہندوستان سے ہی یہاں پنڈت حضرات آتے ہیں۔ انھیں یہ جان کر بھی بے حد خوشی ہوئی کہ میں مسلمان ہو کر بھی سنسکرت جانتا ہوں اور ان کے مذہب کے بارے میں نسبتاً اچھی معلومات رکھتا ہوں۔

پاکستان میں اکثر ہندو مندروں کا یہی حال ہے کہ وہاں کے پجاری اپنے مذہب کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ ان کا انحصار زیادہ تر اُن کتابوں کو پڑھ کر سنانے پر ہوتا ہے جو ہندوستان سے چھپ کر آتی ہیں۔ سنسکرت تو کجا، دیوناگری (ہندی) رسم الخط بھی پڑھنے کے اہل نہیں ہیں حالانکہ بمشکل یہ رسم الخط پندرہ بیس دنوں میں سیکھی جاسکتی ہے۔

یہاں کچھ دیر گفتگو کے بعد ہم نے واپسی کا ارادہ کیا۔ مگر ابھی ہم نے گاڑی میں ذرا ہی سفر کیا تھا کہ ایک منظر نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر دیا اور میں نے ڈرائیور سے فوراً وہیں رکنے کو کہا۔

ذوالجلال والاکرام

یہاں دریائے ہنگول کا کوئی کنارہ تھا جس کے سر پر بلند قامت پہاڑ سائے کیے ہوئے تھا۔ یہ پہاڑ رنگوں کی بہت ہی خوبصورت ترتیب سے مزین تھا۔ سست رفتاری سے بہتا ہوا پانی اور اس میں پر عظمت پہاڑ کا عکس۔۔

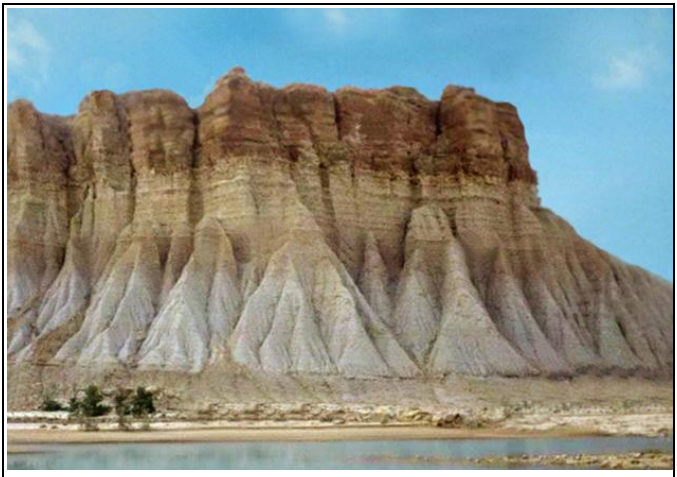

دریائے ہنگول کے کنارے

یہ منظر زبانِ عکس سے خدا کے جاہ و جلال کو بیان کر رہا تھا اور میری زبان پہ بے اختیار یا ذوالجلال والاکرام کا ورد جاری ہو گیا۔ کچھ دیر میں دل پر سکون ہوا تو میں اپنے دوست کے ہمراہ دریا کنارے بیٹھ گیا۔ پانی بہت ہی شفاف تھا ، میں نے ہتھیلی میں لینے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ بہت ٹھنڈا بھی تھا۔ یہاں میرا دل جو خیالات بُن رہا تھا اسے وہیں اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیے تھے۔

پی بھی سکتے ہو۔۔۔پلا بھی سکتے ہو۔۔۔وجدان کا مکالمہ

کیا تم نے اس دریا کو غور سے دیکھا ہے ؟

دیکھو۔ کتنا تیز بہتا ہوا پانی ہے۔ ذرا بھی ٹھہراؤ نہیں۔ اپنے بہاؤ کی مستی میں یہ کئی درختوں، زمینوں اور پہاڑیوں کو کاٹ کر گزر جاتا ہے اور نتیجہ دیکھو، یہ گدلا پانی نہ تم پی سکتے ہو نہ پلا سکتے ہو۔

مگر موسمِ سرما میں اسے دیکھو!

ماحول کچھ سرد ہوتا ہے۔ دریا میں کوئی شور نہیں ہوتا۔ اس کا جوش ناپید ہوتا ہے۔ رفتار بہت دھیمی ہوتی ہے مگر یہ کسی مٹی یا پتھر سے گدلا نہیں ہوتا۔ اس کی مقدار بھی بہت کم ہوتی ہے مگر یہ شیشے کی مانند شفاف ہوتا ہے۔ تم اسے پی بھی سکتے، پلا بھی سکتے ہو۔

یہی کچھ تو ہماری داخلیت ہے۔ یہی تو ہمارے لاشعور کی تصویر ہے۔ جب سرگرم ہو تو اس میں ایک طغیانی بپا ہوتی ہے۔ خیالات و جذبات کا جوش و تلاطم سے یہ گدلا ہوتا ہے۔ لاشعور کا یہ دریا نہ تمہارے قلب کی تشنگی مٹا سکتا ہے نہ دوسروں کے لیے راحت کا باعث بن سکتا ہے۔

مگر جب تم پُر سکون ہوتے ہو، جب تم پر کوئی مستی، کوئی ہیجان نہیں ہوتا۔ جب تمہارے لاشعور کا دریا خیالات کے ہجوم سے خالی ہوتا ہے۔ بہاؤ بھی بہت دھیما ہوتا ہے اور جذبات کی مقدار بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ مگر یہ چاندی کی طرح شفاف و سپید ہوتا ہے۔ اور تم اسے۔۔۔

پی بھی سکتے ہو، پلا بھی سکتے ہو!

یہیں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا، اور کچھ دیر آرام کر کے ساحل "کنڈ ملیر" کے لیے روانہ ہو گئے۔

میں نے پیچھے بیٹھنے کو ترجیح دی تا کہ انکل کی بے تکلفی سے خود کو محفوظ رکھ سکوں لیکن محترم کو میری رفاقت اس قدر بھا گئی تھی کہ یہ دیکھتے ہی کہ میں پیچھے بیٹھا ہوں، وہ بھی پیچھے آ گئے۔ اب کی بار یہ میرے کانوں میں اپنے سُر یلے گلے کا رس گھولنے کا ارادہ کر کے بیٹھے تھے۔ چنانچہ سارے راستے نور جہاں اور لتا کے نغمے میرے کان کے پردے ہلاتے رہے۔ اس پر حد تو یہ

تھی کہ ہر نغمے کے اختتام پر وہ مجھ سے اپنے فنی مظاہرے پر رائے طلب کرتے۔ مرتا کیا نہ کرتا! خدا معاف کرے نہ جانے ہم نے بڑی منافقت سے کتنے توصیفی کلمات ان کی شان میں کہہ دیے۔

میری بھرپور کوشش تھی کہ کسی طرح اپنی توجہ باہر رکھوں تاکہ مناظر سے لطف اندوز ہو سکوں، راستے میں ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف شفاف سمندر کا منظر تھا، لیکن مصیبت یہ بھی تھی کہ وہ کھڑکی کی جانب ہی بیٹھے تھے۔ میں جونہی باہر کی جانب دیکھنے کی کوشش کرتا تو وہ نغمہ روک کر اپنا بڑا سا سر کھڑکی کے آگے کر دیتے اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ مجھے اس موقع پر شاعر نذیر بنارسی یاد آ گئے جو شاید میرے لیے ہی کہہ گئے تھے کہ

راستہ روکے ہوئے کب سے کھڑی ہے دنیا

نہ ادھر ہوتی ہے ظالم نہ ادھر ہوتی ہے

اگور کے مقبرے

ابھی ہم راستے میں ہی تھے، مگر لگ بھگ آدھے گھنٹے بعد گاڑی رک گئی۔ ہمارے پلان کے مطابق اگلی منزل کنڈملیر کا ساحل تھا، مگر معلوم نہیں کہ یہ کب ہمارے پلان میں شامل ہوا۔ ڈرائیور نے وہاں گاڑی اندر لی اور کچھ ہی

دیر میں ایک جگہ اتر گئے۔ یہاں اترتے ہی سامنے ایک پتھر کی تختی نظر آئی جس پر درج تھا کہ یہ محمد بن قاسم کے سپاہیوں کی آخری آرام گاہیں ہیں۔

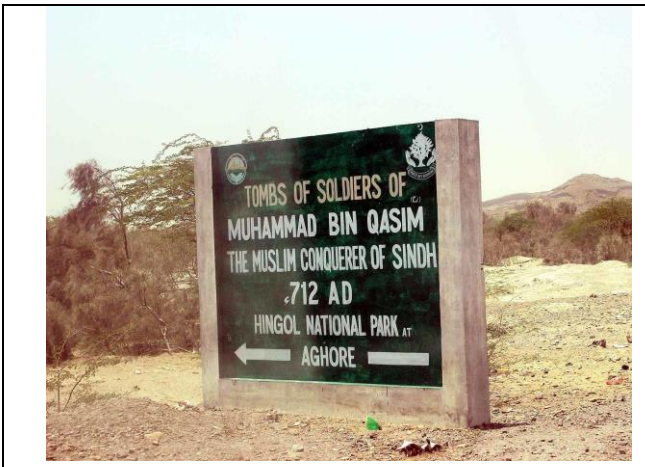

کہا جاتا ہے کہ یہ محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ میں آنے والے سپاہیوں کی قبریں ہیں۔ البتہ تمام محققین اس پر اتفاق نہیں کرتے۔ سفر نامہ نگار سلمان

رشید کا موقف ہے کہ آٹھویں صدی کے عرب اپنے مُردوں کی قبروں کو اس طرح کندہ کاری سے مزین نہیں کیا کرتے تھے جیسا کہ یہاں یا سندھ کے چوکنڈی قبرستان میں نظر آتا ہے۔ ان کے مطابق یہ طرزِ تعمیر آٹھویں نہیں بلکہ سولہویں صدی کے آس پاس کا معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوسری تحقیق، جس کا ذکر مؤرخ منان احمد آصف نے اپنی کتاب "A Book of Conquest" میں کیا ہے، ان قبروں کو اٹھارہویں صدی سے جوڑتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کسی عرب سپاہی کی نہیں بلکہ کسی مقامی بلوچ کی قبر ہو جو کبھی محمد بن قاسم کے لشکر کا حصہ رہا ہو، اور صدیوں بعد لوک روایت نے اسے فاتح کے سپاہی کا نام دے دیا ہو۔

مجھے یہاں کھڑے ہو کر یہ سوچ آئی کہ تاریخ اور روایت میں فرق دراصل یادداشت اور خواہش کا فرق ہے۔ لوگ اکثر وہی یاد رکھتے ہیں جو انھیں یاد رکھنا ہوتا ہے، تاریخ نہیں بلکہ ایک قصہ، ایک عقیدہ، ایک اپنائیت کا احساس۔ یہ بے نام قبریں شاید کسی فاتح کی نہیں، کسی بھولے بسرے مسافر کی ہیں جسے صدیوں بعد ایک عظیم نام دے کر امر کر دیا گیا۔ اور شاید یہی اس صحرا کا سب سے بڑا سبق ہے: کہ نام، لقب، اور فتح کی کہانیاں مٹی میں مل جاتی ہیں، باقی رہ جاتا ہے صرف وہ خاموش پتھر جو گواہی دیتا ہے کہ یہاں کوئی دفن ہے۔

یہاں ہم زیادہ دیر نہ رہے۔ ان خاموش مقبروں کو پیچھے چھوڑ کر ہم دوبارہ کوسٹل ہائی وے پر آ گئے۔ تقریباً بیس منٹ کے سفر کے بعد سمندر کی نیلاہٹ افق پر نمایاں ہونے لگی اور کچھ ہی دیر میں ہم کنڈ ملیر کے ساحل پر پہنچ گئے۔

یہاں ہم نے پہلے نماز ادا کی اور پھر ہمارے سبھی دوست سمندر میں نہانے چلے گئے اور میں خود کو انکل کے چنگل سے بچاتے ہوئے ساحل کنارے جا کر ٹہلنے لگا۔ میں ابھی تک سابقہ مناظر کی قید میں تھا۔ مندر میں خدا کی حکمت و مشیت، حمد و ثنا، دریائے ہنگول کے سامنے اس کا جلال اور قدرتی مناظر میں اس کی شانِ جمال کو محسوس کر آیا تھا۔

ساحل سمندر

کنڈ ملیر کا ساحل

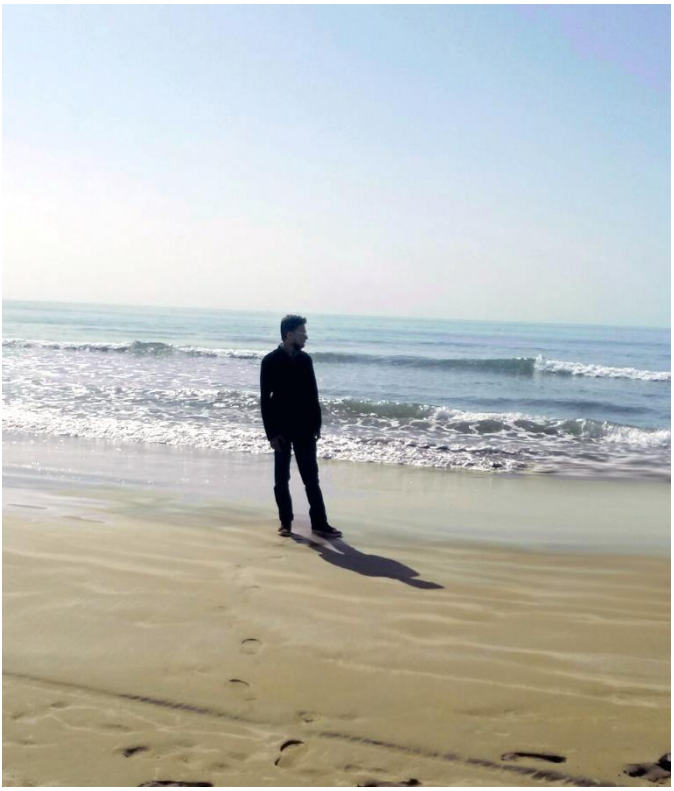

کنڈ ملیر کا ساحل

سمندر تو ہمیشہ سے ہی دیکھا تھا، مگر اب یہ سمندر بھی مجھے خدا کی بے پناہ رحمت و وسعت کی نظیر لگ رہا تھا۔ زمین پر لہریں میرے پیروں کو چھُو رہی تھی اور میرا ذہن آسمانِ تخیل کو۔

ہمیں واپس کراچی کے لیے چار پانچ گھنٹے سفر کرنا تھا، اس لیے اب مناسب تھا کہ ہم واپسی کا سفر شروع کر دیں۔ لہٰذا آرگنائزر نے واپسی کی اطلاع دی اور ہم سب اپنے اپنے دامن میں یادوں کے تحفے لیے واپس گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اب کی بار میری قسمت اچھی تھی کہ انکل میرے پاس نہ بیٹھے، ایک ڈیڑھ گھنٹہ گپ شپ کے بعد گاڑی میں بھی سبھی لوگ تھک ہار کر سونے کی کامیاب کوشش میں گم گئے۔ میں اپنے نوٹ پیڈ میں اپنے تجربات تحریر کرنے لگا۔

اس سفر میں مَیں نے دیوی کا مجسمہ بھی دیکھا، خدا کی حمد میں گائے گئے بھجن بھی سنے، نامعلوم سپاہیوں کی قبر بھی دیکھی اور دریا کا شفاف پانی بھی۔ اب میں نے موبائل پر حمد و نعت لگائی اور پتہ ہی نہ لگا کہ کب شام ڈھلی اور میں بھی دوستوں کے ہمراہ خوابوں میں غوطہ زن ہو گیا۔

مزید تصاویر

Shariq